کچھ بچا لائے ہیں
(منتخب کلام)
اختر عثمان
AB

1
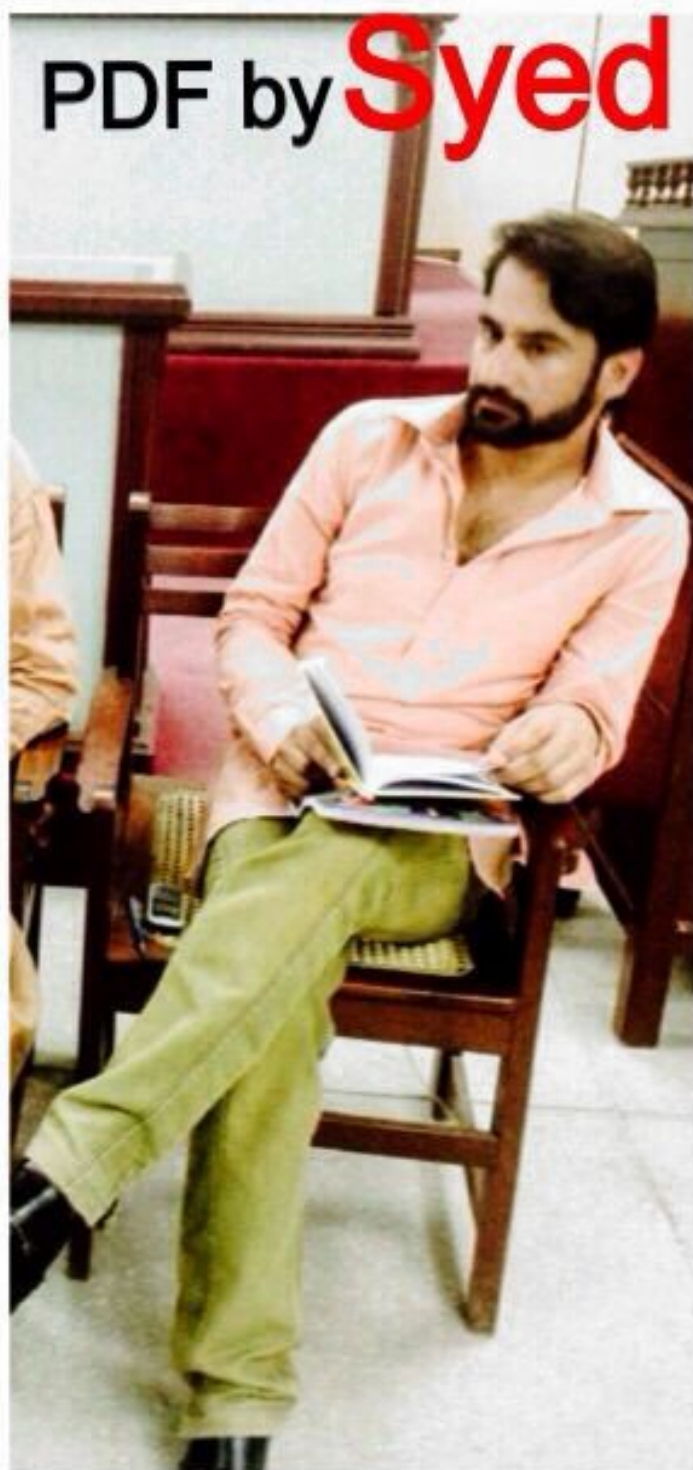
ناشر

ایلیاء بُکس
AB AILYA BOOKS

نام کتاب	:	کچھ بچالائے ہیں
شاعر	:	اختر عثمان
سرِورق	:	عباس
تزئین/ کمپوزنگ	:	قمرالزمان
بارِ دوم	:	2007ء
مطبع	:	الاعتماد پرنٹرز داتا دربار لاہور فون نمبر: 7115774
قیمت	:	150 روپے

اسٹاکسٹ: فکشن ہاؤس 18 مزنگ روڈ لاہور
فون نمبر: 042-7249218

پبلشر نوٹ

اس عہدِ نفساں میں جب کتب خانوں کی جگہ فاسٹ فوڈ ریسٹورنٹ لے رہے ہیں کتاب دوستی خاصے کی چیز بن کر رہ گئی ہے علم وادب کی ترویج کے لئے سنجیدہ اور تاریخی موضوعات پر کتابوں کی اشاعت اور ارزاں نرخوں پر پڑھنے والوں کو فراہم کرنے کے لئے ایلیاء بکس کے نام سے اشاعت گھر کے قیام کا مقصد تجارت سے زیادہ فروغ آگہی ہے ہم اس عزم کے ساتھ فروغ علم کے اس مشن کا آغاز کر رہے ہیں کہ ایک بار پھر سے ہمارے سماج میں وہ دور واپس آئے جب کتاب دوستی، انسان دوستی کی طرح لازمۂ زندگی تھی۔ ہم عقلِ کل یا حرفِ آخر ہونے کے مدّعی ہرگز نہیں، صاحبانِ علم و ادب اور کتاب دوست حضرات سے راہنمائی لیتے اور اصلاح کرتے رہیں گے۔

ڈائریکٹر

ایلیاء بکس

0321-9447837
0334-4944551

ضرور آئے گا اب کوئی گفتگو کرنے
میں اس کے آنے سے پہلے کا شورِ محفل ہوں

اختر عثمان

سید تصور عباس کاظمی

منظر نقوی

جہانگیر عمران

تابش کمال

ڈاکٹر اختر شمار

احمد لطیف

کے

نام

سلسلہ

تراش خراش

انتخاب، اور پھر اپنا انتخاب! اِس کرب وطرب کا اندازہ جبھی ہو سکتا ہے کہ ضارب بھی آپ ہوں اور مضروب بھی۔

''کچھ بچالائے ہیں'' میری اُن غزلوں سے انتخاب ہے جو 1995ء تک تخلیق ہوئیں۔ زیرِ نظر انتخاب ہو یا کوئی اور، ہمیشہ کسی نئے انتخاب کا تقاضا کرتا ہے۔ میری کوشش رہی ہے کہ تہذیبی جمالیاتی سطح پر مکالمہ قائم ہو سکے اس ضمن میں میری کامیابی یا ناکامی کا فیصلہ تو آپ کریں گے۔

امید کرتا ہوں کہ میرے تخلیقی لمحات میں آپ کی شرکت مجھے اگلے سفر کا حوصلہ دے گی۔ دستِ شوق بڑھایئے کہ یہ سوغات آپ کے انتظار میں ہے۔

اختر عثمان
180, I-10/4
اسلام آباد

انتخاب در انتخاب

''کچھ بچا لائے ہیں'' کا یہ ایڈیشن برادرم حیدر جاوید سیّد کی سعیٔ کاملہ کا نتیجہ ہے۔ میں نے صرف یہ کیا کہ حسبِ معمول اشاعتِ اوّل میں مزید کانٹ چھانٹ کی۔ کچھ غزلیں اور اشعار قلم زد کر دیے ہیں تا کہ کم ہُنری کا احساس گھٹ سکے اور میرے قارئین قدرے خوشگوار سخن سے حظ اندوز ہوں۔ معیار کا فیصلہ ایک گڑھے ہوئے قاری اور ایک تربیت یافتہ ناقد کے سوا کون کر سکتا ہے!

میں انتخاب در انتخاب کے سلسلہ میں تمام احباب کا امتنان گزار ہوں اور زیبائش و آرائش کے حوالے سے برادرم قمر الزمان کا شکریہ ادا کرتا ہوں اور اشاعتِ دوم پر حیدر جاوید سیّد کا بھی ممنون ہوں۔ امید ہے کہ ''کچھ بچا لائے ہیں'' کی اشاعتِ ثانی پہلے کی طرح آپ کے تہذیبی حافظے میں کچھ نہ کچھ جگہ مزید تلاش کر لے گی۔

اختر عثمان

0300-5345626

ابھی تو پر بھی نہیں تولتا اُڑان کو میں
بِلا جواز کھٹکتا ہوں آسمان کو میں

مفاہمت نہ سکھا دشمنوں سے اے سالار!
تری طرف نہ کہیں موڑ دوں کمان کو میں

مری طلب کی کوئی چیز شش جہت میں نہیں
ہزار چھان چکا ہوں تری دُکان کو میں

نہیں قبول مجھے کوئی بھی نئی ہجرت
کٹاؤں کیوں کسی بلوے میں خاندان کو میں!

تجھے تخیلِ فلک سے پٹخ نہ دوں آخر
ترے سمیت گرا ہی نہ دوں مچان کو میں

یہ کائنات مرے سامنے ہے مثلِ بساط
کہیں جنوں میں اُلٹ دوں نہ اِس جہان کو میں

کیسے بہل سکوں گا کسی التفات سے
آگے بھی ہے جنون مجھے، شش جہات سے

مہتاب، جھیل، ناؤ، کنارا، شجر، ہوا
سہمے ہوئے ہیں قتل کی اس واردات سے

میرے لہو کی لَو سے چمکتی ہے رزم گاہ
جھڑتی ہے روشنی مرے قاتل کے ہات سے

ہر اصل ساتھ لے اُڑا طوفانِ گرد و باد
چہرے اُڑے ہوئے ہیں غبارِ ممات سے

وہ چودھویں کا چاند کہ سَر تھا صلیب پر
بنتی نہیں ہے بات کوئی گنگ رات سے
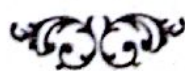
شعورِ فاصلۂ خیر و شر دیا ہے مجھے
تری نگاہ نے تبدیل کر دیا ہے مجھے

مرا مقام کہیں اور تھا، یہ لگتا ہے
کسی نے رَو میں کہیں اور دھر دیا ہے مجھے

بس اک گلہ سا تری چشمِ نیم باز سے ہے
کہ اُس نے وقت بہت مختصر دیا ہے مجھے

مجھے خبر نہیں سودا ہے یا تجسّس ہے
مرے خمیر نے کیا دردِ سَر دیا ہے مجھے!

میں اپنی راہ بنا لوں گا کوہساروں میں
خرد نے کوہکنی کا ہُنر دیا ہے مجھے

سَرِ کُوئے خرابی سَر بسر بنتے رہیں گے
تری تکمیل تک ہم ٹوٹ کر بنتے رہیں گے

ہماری سمت کی وسعت سے واقف ہے زمانہ
ہمارے دم سے معیارِ نظر بنتے رہیں گے

مکاں کے منہدم ہونے کا کوئی غم نہیں ہے
مکیں باقی رہے تو اور گھر بنتے رہیں گے

ابھی تو خیر سے آنکھیں سلامت ہیں کسی کی
ہمارے عیب جتنے ہیں، ہُنر بنتے رہیں گے

اِسی صورت ہماری جان پر بنتی رہی تو
ہمارے خال و خد بھی چاک پر بنتے رہیں گے
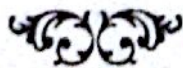
اب مجھے اور کہیں بھی تو نہیں جانا ہے
چین کرنے کو ذرا زیرِ زمیں جانا ہے

راستہ دیکھتا ہے اپنا تغارِ مرقد
آخرش کالبدِ گِل کو وہیں جانا ہے

چند سانسوں کی رفاقت ہے، تھکن بانٹ نہ لیں!
ہم سفر! تجھکو کہیں، مجھکو کہیں جانا ہے

رات ڈھلنے کو ہے، اور آخری گاڑی والا
مجھ سے کہتا ہے کہ تجھکو بھی کہیں جانا ہے!

2

مِلو، کہ بعد میں شاید یہ سلسلہ نہ رہے
یہ رنگ و گُل نہ رہیں، صحبتِ صبا نہ رہے

قریب تر ہے وہ عہدِ زیاں نصیب، کہ جب
بشر، بشر نہ رہے اور خُدا، خُدا نہ رہے

وہاں بھی راہ سُجھاتی ہے اپنے لفظ کی لَو
چراغِ چشم جہاں گُل ہو، راستہ نہ رہے

سفر میں چند مراحل کڑے پڑے ہیں تو کیا
ہمیں جنوں تھا کہ رستہ بجھا بجھا نہ رہے

ہمارے نام پہ گھونگھٹ اُٹھا، نگارِ صلیب!
ہمارے سَر پہ ترا کوئی بھی گلہ نہ رہے

بس تماشائی تھے، منظر میں کہاں تھے ہم بھی
صورتِ آئنہ ہر سُو نگراں تھے ہم بھی

یہی پیرایۂ خوشبو، یہی اسلوبِ ہوا
باغِ احساس میں بے نام ونشاں تھے ہم بھی

اے کہ تُو موج میں آتا ہے تو دل ڈُوبتا ہے
اب تہِ خاک جو خُفتہ ہیں، رواں تھے ہم بھی

گہے گرداب، گہے گشت بگولے کی طرح
خود سے اُٹھتے تو کَراں تا بہ کَراں تھے ہم بھی

یہی آشفتہ مزاجی تھی، یہی گرم رَوی
تجھ کو دیکھیں تو یہ لگتا ہے کہ ہاں، تھے ہم بھی

مسا و صبح کے سب سلسلے بھی دیکھتا ہوں
میں سامنے بھی، اُفق سے پرے بھی دیکھتا ہوں

عجب رسائی و پسپائی کا زمانہ ہے
ترے قریں ہوں مگر فاصلے بھی دیکھتا ہوں

جہان دیکھنا پڑتا ہے اک نگہ میں مجھے
میں شش جہات کو، خود کو، تجھے بھی دیکھتا ہوں

مجھے عزیز ہے معیار میرا اپنا بھی
میں تیرا حُسن تری آنکھ سے بھی دیکھتا ہوں

مرے لئے تو غیاب و شہود کچھ بھی نہیں
تُو اوٹ میں ہے، تجھے سامنے بھی دیکھتا ہوں

عطا کیا ہے مجھے تُو نے دیکھنے کا مذاق
سنور کے بیٹھ کوئی دم، تجھے بھی دیکھتا ہوں

رات اک عُمر دردِ زہ میں رہی
تب کہیں آفتاب نکلا ہے

اک غزل اور ہو گئی اخترؔ
اور اک اضطراب نکلا ہے

آج ہوتے سَرِ قرطاس جو کہتے رہتے
ہم سے کتنے ہی سخن رہ گئے رہتے رہتے

زندگی! اب کوئی آہنگِ جُدا، رنگِ دگر
ہم تو اُکتا گئے اک وقت میں رہتے رہتے

آرمیدہ ہیں تہِ خاک تو اب سوچتے ہیں
کیا بُرا تھا جو اُسی موج میں بہتے رہتے

کسی خیال، کسی وسوسے میں کھوئی ہوئی
وہ آج پھر نظر آئی تھی روئی روئی ہوئی

ہَوا چلی ہے تو جاگی ہے قُرب کی خواہش
یہ آگ بھی تھی دلِ سوختہ میں سوئی ہوئی

کہاں گئے مرے اجداد، آئیں اور کاٹیں
سَر آ گئی ہے اندھیروں کی فصل بوئی ہوئی

تری نظر کے طلسمِ غزل سے گزرا ہوں
میں ٹوٹ پھوٹ میں کیسے عمل سے گزرا ہوں

فراغ دیتی نہیں ذات کی تراش خراش
ہزار بار کے ردّوبدل سے گزرا ہوں

وہ قرن قرن کے جس میں کھلے ہیں مجھ پہ حجاب
ابھی ابھی میں اُسی ایک پل سے گزرا ہوں

سفر پذیر نہیں ہوں اِسی زمانے میں
میں اپنے آج میں رہ کر بھی کَل سے گزرا ہوں

دکھائی پڑتا نہیں جو کہیں سَرِ آفاق
میں رات ایسے بھی دَورِ غزل سے گزرا ہوں

مرا کمال کہ لُو کو صبا کیا میں نے
مرا نصیب کہ ہر بار تھل سے گزرا ہوں

موج در موج ہوں میں اپنے بھنْور کی زد میں
روزِ اوّل سے رہا سایۂ دریا مجھ پر

عین ممکن ہے یہ کچھ روز میں کھا جائے مجھے
کون مانے گا کہ آسیب تھا اپنا مجھ پر

ہر عکس مرا عکس ہو اتنا بھی نہیں میں
اِس آئنہ خانے میں کہیں تو ہے، کہیں میں

یہ میرے بدن پر جو سلگنے کے نشاں ہیں
یوں ہیں کہ ذرا بھر کو ہُوا اُس کے قریں میں

اک وقت میں کتنے ہی گمانوں سے گزر کر
لکھتا ہوں یہ کچھ لفظ سَرِ لوحِ یقیں میں

یہ عالمِ نابود ہے یا بود ہے، کیا ہے؟
میں کہتا ہوں "میں ہوں" کوئی کہتا ہے "نہیں، میں"

وہ دَر تو بنا ہے نہ بنے گا کبھی اخترؔ
جس کے لئے پھرتا ہوں لیے اپنی جبیں میں
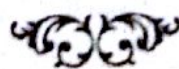
ہمارے ہاتھ میں جو نقش تِلمِلاتے ہیں
انہیں اٹھانے کو ہم آب و گِل مِلاتے ہیں

چلو کہ بھوگ لیں مل کر سزائے جذبہ و خواب
نظر، نظر سے ملے، دل سے دل مِلاتے ہیں

قدم قدم پہ تماشائے ہجر دیکھنے کو
یہ لوگ مجُھ سے اُسے مستقل مِلاتے ہیں

ابھی تو آئنہ کُچھ کُچھ دکھائی دیتا ہے
ابھی نگاہ میں کُچھ خواب جِھلمِلاتے ہیں
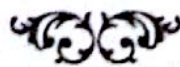
عکسِ حسرت ہے کہ امکان کی چھب ہے کوئی
ایسا لگتا ہے پسِ پردۂ شب ہے کوئی

دل کے صحرا میں بجز خاک نہیں ہے کچھ اور
بس ہَوا پوچھتی پھرتی ہے کہ "اب ہے کوئی!"

بوسہ بردوش صبا! ڈھونڈ رہی ہے کس کو
آگ ہی آگ ہے، گُل ہے کوئی، لب ہے کوئی؟

میں اِسی آئنہ خانے میں، اِنھی لوگوں میں
تھا، مگر اب جو نہیں ہوں تو سبب ہے کوئی

دِل سے جو ہات لپکتا ہے گُلِ نو کی طرف
یہ گماں ہوتا ہے اس کو بھی طلب ہے کوئی
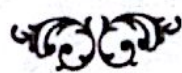
کیا کیا جائے کہ فرصت ہی نہیں حیرت سے
جیسے ہم صرف یہاں دیکھنے کو آئے ہیں

ہم سے شبنم نفساں بھی تھے بہ گُل خانۂ دہر
جو کوئی کام نہ کر پائے تو رو آئے ہیں

ہم سے بھی کوئی نئی شکل بنائی نہ گئی
ہم بھی موتی اُسی دھاگے میں پرو آئے ہیں

مذاقِ بیعتِ دنیا تو عُمر بھر نہ رہا
ہمارا ہات زمانے کے ہات پر نہ رہا

نظر میں شعلۂ شمعِ شعور تھا اختؔر
کسی قدم پہ بھٹکنے کا کوئی ڈر نہ رہا

جب دُور ہیں تجھ سے تو یہ اُفتاد بھی آئے
طوفانِ شبِ دشت میں تُو یاد بھی آئے

حیران ہے اِس بات پہ انبوہِ اسیراں
پر کُھلنے کی تقریب میں صیّاد بھی آئے

ہارے ہوئے لشکر کا علم گر بھی چکا ہے
اب کیا جو کسی سمت سے اِمداد بھی آئے

اک عُمر ہوئی نذرِ خرابات ہماری
صد شکر سَرِ قریۂ آباد بھی آئے

اک بُو کہ بغل گیر ہوئی دشت میں ہم سے
جیسے یہاں پہلے کبھی اجداد بھی آئے
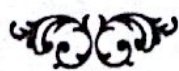
مماثلت ہے یہی مجھ میں اور چناروں میں
خزاں کے ڈر سے بھڑکنے لگیں بہاروں میں

کسی بھی خطّے میں پائی نہ اپنی بُوئے خمیر
مرے وجود کی مٹّی ہے کن تغاروں میں

مرا سلیقۂ تیشہ گری کہ تُو جھلکا
مسامِ سنگ سے نکلے ہوئے شراروں میں

یہ شرق وغرب، جنوب وشمال بھی کب تک
نہیں قبول مجھے کوئی سمت چاروں میں

ابھی تو خیر سے ہے آہوئے وطن اختر
ابھی سے کھال کا جھگڑا ہے کیا چماروں میں

ترے بغیر کہاں کی غزل سرائی ہے
صدا سے پہلے کبھی بازگشت آئی ہے

ترے جمال کی تجسیم سہل کام نہیں
یہ معجزہ بھی مرے شعر کی صفائی ہے

زمیں کے ہجر میں رہنا مجھے قبول نہیں
فلک سے آگے بھی یوں تو مری رسائی ہے

"میں اپنے آپ کو ترتیب دے رہا ہوں ابھی"
مرا مقام وہاں ہے جہاں اکائی ہے

کشیدِ جاں سے غزل پُر اثر بناتا ہوں
میں اپنا وار بہت کارگر بناتا ہوں

ترا خمیر اُٹھاتا ہوں اپنے ملبے سے
تجھے بناؤں تو پھر ٹوٹ کر بناتا ہوں

ترے جہان کی بنیاد میری کوزہ گری
نگار و نقشِ زماں چاک پر بناتا ہوں

نہیں قبول مجھے قرض کا تموّج بھی
میں اپنی موج میں رہ کر بھنور بناتا ہوں

سبک ہَوا میں مرے بادبان دیدہ و دل
میں اِن کے رُخ پہ ہی سمتِ سفر بناتا ہوں

3

وہ بھی نہ کھُلا، بستۂ پندار تھے ہم بھی
خاموش تھا وہ، صورتِ دیوار تھے ہم بھی

حد بندئ احساس رہی عُمرِ معیّن
اور دائرۂ کار میں پرکار تھے ہم بھی

اے نرگسِ وا چشم! ترے اَوج کے دِن ہیں
تیری ہی طرح دیدۂ بیدار تھے ہم بھی

ہم بھی تھے اُنہی میں جو زباں سے نہ پھرے تھے
پھر خلق نے دیکھا کہ سَرِ دار تھے ہم بھی

آجر سے جو اُجرت ہمیں پہنچی یہی پہنچی
جب قصر گرا تھا تہِ دیوار تھے ہم بھی

کیا لپک رکھتی ہیں بھرپور نگاہیں اُس کی
آئنے ایک جھلک دیکھنا چاہیں اُس کی

خطِ پُر نور سا کھنچ جائے افق تا بہ افق
سرِ احساس دمکنے لگیں راہیں اُس کی

ہم خجل خوار سہی، بے در و دیوار سہی
ہم پہ کُھلتی ہیں بہر گام پناہیں اُس کی

ڈوب کر بھی وہ ستارہ نہیں ڈوبا، اب تک
گونجتی رہتی ہیں احساس میں آہیں اُس کی

وسعتِ فکر تو اک بات ہے اختر عثمان
تا بہ امکان ہیں پھیلی ہوئی باہیں اُس کی

نہیں زمیں پہ کسی کا بھی اعتبار مجھے
کہا تھا کس نے کہ افلاک سے اُتار مجھے

بہ چرخِ کُوزہ گرِ دہر چیختا ہے کوئی
میں جیسے حال میں ہوں چاک سے اُتار مجھے

تُجھے کہا تھا کہ لَو دے اُٹھے گی لاش مری
تُجھے کہا تھا کہ تُو روشنی میں مار مجھے

تری صدا کے پلٹنے سے قبل پہنچوں گا
تُو ایک بار بہ جذبِ جنوں پکار مجھے

کبھی تو ماں کی طرح ٹوٹ کر ملے اخترؔ
کبھی تو دوڑ کے سینے لگائے دار مجھے

شاید کہ نظر آئے کہیں رنگِ نمو میں
مدّت سے کوئی عکس مچلتا ہے لہو میں

دیکھا نہ کہاں ہم نے تجھے اے گُلِ امکاں!
*مہتاب میں، آئینے میں، دریا میں، سبو میں

تب جا کے صبا صُورتِ احساس میں آئی
اک عُمر ہَوا ہو گئی افکار کی لُو میں

اک سوزشِ بے نام صدا میں ہے ابھی تک
اک تِیر کہ ہے آج بھی پیوست گُلو میں

ہستی کا اگر ہے کوئی مفہوم تو یہ ہے
زخموں میں کوئی روز کٹے، کوئی رفو میں

* مستفاد از حافظ

اک دَر سے اُمید کیا لگی ہے
اب آنکھ ذرا ذرا لگی ہے

کس رنگ میں بارور ہُوا ہوں!
ہر شاخ زمیں سے آ لگی ہے

زیبا نہیں تُجھکو لُو کا لہجہ
تُجھکو تو ابھی ہَوا لگی ہے

تُو راکھ، تو میں طِلا ہُوا ہوں
یہ آگ جُدا جُدا لگی ہے

جو وہم ہے ڈَر ہے پس پردہ، نہیں نکلا
بستی سے ابھی تک وہ بگولا نہیں نکلا

ہندَسہ کی طرح جسم ادھیڑا تھا ہَوا نے
لیکن مرے سینے سے کلیجہ نہیں نکلا

کچھ ہم ترے معیار پہ پورے نہیں اُترے
کچھ تو بھی کہ مشہور تھا جیسا، نہیں نکلا

گو شہر میں پیمائشِ قد عام ہے لیکن
اک شخص بھی ہم قامتِ سایہ نہیں نکلا

پوشاکِ رفو کار کے کیا کہنے کہ اخترؔ
اک تار گریبان میں اپنا نہیں نکلا

گم کردۂ احساس ہوں گھر تک مجھے لے جائے
ایسی کوئی دیوار جو دَر تک مجھے لے جائے

پھر آئے کوئی لہر، بھنْور تک مجھے لے جائے
پھر کوئی خطا اُس کی نظر تک مجھے لے جائے

اُس چشمِ صدف ناز کا ایسا ہے تصوّر
جو ذہن میں آئے تو گہر تک مجھے لے جائے

تُوں تُوں وسعت پائے دل پھیلانے سے دریا
جُوں جُوں جھڑ کر مٹّی نیچے جائے کناروں سے

ان پر بیتنے والی ہر کیفیّت میری ہے
میرا جینا مرنا ہے میرے کرداروں سے

کڑی کڑی سے جُڑے ایک سلسلہ ہو جائے
یہ دِل مِلے جو نظر سے تو کیا سے کیا ہو جائے

میں شش جہت میں سراپا طلسمِ حیرت ہوں
مجھے جو غور سے دیکھے وہ آئنہ ہو جائے

مرے جہان کی رونق تری نظر تک ہے
تری نگاہ بدلتے ہی جانے کیا ہو جائے

ابھی میں حالتِ جولانیٔ جنوں میں نہیں
ابھی حجاب کو موقع ہے آپ وا ہو جائے

غضب کا زنگ ہے یک سطحِ شیشۂ دل پر
عجب نہیں یہ کوئی دِن میں آئنہ ہو جائے

غمزۂ چشمِ فسوں ساز سے اعجاز کرے
تُو دلوں پر نئی دنیاؤں کے در باز کرے

تیرے قدموں میں جگہ پائے تو رم سیکھے غزال
تیرے پہلو میں صبا چلتے ہوئے ناز کرے

تیرے ابرو سے شگوفے کو ملے اذنِ کلام
تیری تحسین اُسے زمزمہ پرداز کرے

تُو جو بولے تو بڑھے قیمتِ انشائے لطیف
اور اجمال میں کچھ اور سا ایجاز کرے

تیرے چہرے کی چمک صبحِ فروزاں سے فزوں
تیرا کاکُل فنِ شب کو نظر انداز کرے

تیری پلکوں میں سمٹ جائیں مضامینِ حیا
تیری خوشبوئے قبا پھول کو ہمراز کرے

تیری پازیب کی لَو لے کے اُڑے توسنِ وقت
طائرِ فکر ترے نُور میں پرواز کرے

تیرے رخسارِ شفق رشک سے ہوتا ہُوا اشک
عارضِ گُل پہ رُکے تو، اُسے ممتاز کرے

وقت ضائع کرے، گر کوئی گرفتار ترا
تیرے جادو سے نکلنے کو تگ و تاز کرے

تیری نسبت کا شرف مجھ سے انا پرور کو
منصبِ اوجِ تغافل پہ سرافراز کرے

تیری تعریف رکھے میرے قصائد کا بھرم
تیری توصیف مجھے لائقِ اعزاز کرے

میری خوش گوئی پہ ہی ختم نہیں تیری عطا
تیرے ہونٹوں سے زمانہ سخن آغاز کرے

دعوتِ خاص نہ ہو، دیکھ کے حافظؔ یہ غزل
یہی کافی ہے اگر دعوتِ شیراز کرے

راہِ سفال گری چلتے کب یونہی حرم آجاتا ہے
کمریں کُوزہ ہو جاتی ہیں، روح میں خم آ جاتا ہے

لفظ اک ایسا آہو ہے جو دامِ ہنرور میں آ کر
چوکڑی بھرنا سیکھتا ہے اور اُس کو رم آ جاتا ہے

پَل دو پَل کے تانیں پلٹے سُر کو باندھ نہیں سکتے
اخترؔ ماترے گنتے گنتے آخر سَم آ جاتا ہے

یہاں آ کر ملا ہے تحفۂ خانہ بدوشی
منادی تھی کہ ہم گھر بار والے ہو گئے ہیں

ہمارا گھر تو پہلے ہی وہاں گروی پڑا تھا
ہمارے ذہن بھی اُس کے حوالے ہو گئے ہیں

(احمد لطیف کے لئے)

چل چل کے بھی دشت روبرو ہے
تعبیر میں خواب کی نمو ہے

کُھلتا ہی نہیں طلسمِ حیرت
اک عقدۂ سحر مُو بہ مُو ہے

مشکل ہے کوئی جواب آئے
دیوار کے ساتھ گفتگو ہے

آنسو ہے، حباب ہے کہ شبنم
یہ میں ہوں کہ آئنہ کہ تُو ہے

کچھ بھی نہ رہے ترے علاوہ
آنکھوں کو عجیب آرزو ہے

تیرے لئے لوگ مجھ تک آئے
دریا کا سُراغ آب جو ہے

اک تار تو ہو بہارِ رفتہ!
امکان کا چاک بے رفو ہے

شاید کوئی نقش سَر اُبھارے
کچھ دن سے لہو میں ہاؤ ہو ہے

جہاں کو خطِّ تناسب پہ لا بنایا ہے
کسی نے خاک سے دیکھو تو کیا بنایا ہے

اِس اہتمام سے پیکر ترا تراشتا ہوں
گمان گزرے کہ جیسے بنا بنایا ہے

مرے چراغ کی لَو کا سفر ہَوا کے خلاف
مرے جنوں نے نیا راستہ بنایا ہے

کسی کے مرقدِ خستہ سے آ رہی ہے صدا
ہمارے بعد کی نسلوں نے کیا بنایا ہے؟

اک عُمر سے ہُوں سلسلۂ ہست و فنا میں
جینا تو کُھلی موت ہے مانگے کی فضا میں

اس چاکِ گریباں سے بڑا کام لیا ہے
پیوند لگاتا رہا خوابوں کی رِدا میں

اُڑنا ہے مجھے اور جہانوں کے لئے بھی
امکان ہیں کچھ اور بھی جذبوں کی ہَوا میں

کچھ کم تو نہیں ہے مری سانسوں کی کمائی
تبدیل کئے جاتا ہوں صَرصَر کو صبا میں

اک جست کی منزل پہ ہیں پھیلے ہُوئے آفاق
اک اور قدم تک ہے زمانہ سَرِ پا میں

4

کہاں یہ خون میں لَت پَت کمان سُوکھتی ہے
جو دیکھتے ہی پرندوں کی جان سُوکھتی ہے

مجھ ایسا شخص اگر تشنگیٔ اہلِ وفا
رقم کرے تو قلم کی زبان سُوکھتی ہے

تری نگہ کی نمی مجھ تک آئے بھی کیسے!
ہَوا کی سانس کہیں درمیان سُوکھتی ہے

چمک دمک ہے، مہک ہے مری ذرا کی ذرا
لہو کی لہر ہے، سو کوئی آن سُوکھتی ہے

یہ اور بات کہ پہلے ہو اَبر سے سیراب
مگر زمین سے پہلے چٹان سُوکھتی ہے
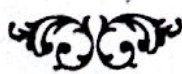
ورثے میں مِلے ہوئے ستارے
دِل میں ہیں سِلے ہوئے ستارے

کچھ عُمرِ گریزپا کی یادیں
کچھ زخم، چِھلے ہوئے ستارے

بے تخت و کلاہ گھومتے ہیں
مرکز سے ہِلے ہوئے ستارے

جذبوں سے بُنی ہوئی کہانی
باتوں میں کِھلے ہوئے ستارے

دیوار و دَر شکستہ تھے، خستہ مکان تھے
وہ کیسے کیسے آئنہ بستہ مکان تھے

ہر چشم آشنا تھی، شناسا تھی ہر گلی
بس جَستہ جَستہ لوگ تھے "جَستہ" مکان تھے

کیا کیا وہ سَروْ تھے جنہیں تعمیر کھا گئی
خوش قامتوں کا دَور تھا، پستہ مکان تھے

دِل بیٹھنے لگے ہیں مکانوں کے حبس میں
کیا دِن تھے جب دِلوں میں نشستہ مکان تھے

صحرا میں صرف آنکھ جھپکنے کی دیر تھی
کوسوں نہیں تھا کوئی بھی رستہ، مکان تھے
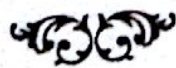
مرے حروفِ ستارہ جمال میں چمکی
وہ کہکشاں جو ترے خدّ و خال میں چمکی

تمام عمر میں پھیلا دیا وہ اک لمحہ
جب ایک برق سی قصرِ خیال میں چمکی

میں تجھ کو دیکھ رہا تھا تجھے بناتے ہوئے
ترے بدن کی لپک تک سفال میں چمکی

بس ایک چھب میں وہ کیا کیا سُجھا گئی اختر
جو اک نمی سی دلِ پائمال میں چمکی

نگاہ یوں بھی نہ ٹھہرے کہ دردِ سَر بن جائے
یہ سنگِ چشم کسی ڈھب سے اب گہر بن جائے

کمالِ کُوزہ گری ہے کہ میں جسے سوچوں
وہ نقش چاک پہ آنے سے پیشتر بن جائے

جدید عہد میں اُلٹا ہے اِرتقا کا سفر
عجب نہیں ہے پِھر انسان جانور بن جائے

میں چاہتا ہوں کہ چکنی چٹان پر ہی چلوں
یہ کیا بعید مرے بعد رہگذر بن جائے

بہت نحیف نہیں ہے گرفتِ حلقۂ چشم
نظر اٹھے تو زمانے کی جان پر بن جائے

کیا اِنتہا دکھائے گی یہ اِبتدا مجھے
کِھلنے سے قبل دیکھ چکی ہے ہَوا مجھے

تہذیبِ خستہ دَم ہوں مرا اعتبار کیا
فُرصت ملے تو ایک نظر دیکھ جا مجھے

کچھ باعثِ قرار نہیں جُز نگاہِ یار
اور وہ نصیب ہو تو زمانے سے کیا مجھے

ممکن ہے میرا اپنا کوئی عکس اس میں ہو
خوش آ گئی طبیعتِ آئینہ زا مجھے

اخترؔ ہَوا تو مجھ سے گریزاں گزر گئی
جانے یہ کس خیال نے دہلا دیا مجھے

کسی ترکے سے نہ احساسِ قلمرو سے ملا
اپنے ہونے کا نشاں اپنی تگ و دَو سے ملا

اے مری خاک میں خوابیدہ شرارِ تشکیک!
سلسلہ سارے چراغوں کا تری لَو سے ملا

مجھ تک آتے ہوئے اک عُمر لگی ہے مجھ کو
پھر بھی میں خود سے نہیں مل سکا، پَرتو سے ملا

شمع کا وصل وسیلوں کے سوا مشکل ہے
میں پتنگوں سے ملا، شب سے ملا، لَو سے ملا

جتنے رستے ہیں وہ سب تیری طرف جاتے ہیں
لیکن اے حُسنِ ابد! تُو کسی رہرو سے ملا
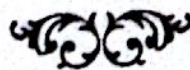
اک عُمر طواف کیا اپنا، گویا کہ کوئی گرداب تھے ہم
اب جا کے کُھلا خود گرد تھے ہم اور اپنے لئے بیتاب تھے ہم

کچھ کوس تمہاری ضو میں کٹے، کچھ اور مہِ دل کی لَو میں
یوں ورنہ مسافتِ ہستی میں اک راہیِ بے اسباب تھے ہم

اِس عادتِ صدق وصفا نے ہمیں چھوڑا نہ کہیں کا بھی صاحب!
اک وہ بھی سہانا زمانہ تھا، خالِ نظرِ احباب تھے ہم

ہر ہر تعبیر سراب ہوئی، اور نیند تو جیسے خواب ہوئی
اے شہرِ تمنّائے حیرت! ویسے بھی کہاں خوش خواب تھے ہم

اک حُسن کی دہشت نے اخترؔ وحشت کو عجب مسحور کیا
پتّھر کی طرح خاموش رہے، پابندِ حدِ آداب تھے ہم

بھنْور، برہم ہَوائیں، گم کنارا، کیا بنے گا
دریدہ بادباں اپنا سہارا کیا بنے گا

بڑوں پر منکشف تھی سہل انگاری ہماری
ہمیں اجداد کہتے تھے ''تمہارا کیا بنے گا!''

ابھی سے خال وخد روشن ہوئے جاتے ہیں اِس کے
کبھی جو چاک پر آیا تو گارا کیا بنے گا

جرائے ذہن میں اُترا ہے جبریلِ تخیّل
بتاتا ہے کہ آئندہ نظارہ کیا بنے گا

نئے سالار سے زنداں میں بچّے پوچھتے ہیں
ہمارے شہر کے فاتح ہمارا کیا بنے گا!

ہَوا کے شر سے دامن ہی بچائے تو بچائے
دریدہ بادباں اپنا سہارا کیا بنے گا

یہ آب و تاب تو مجھ میں ازل ہی سے تھی اخترؔ
مرے تیور بتاتے تھے ستارہ کیا بنے گا

ذرا سا مسئلہ پھیلا تو از حد بڑھ گیا ہے
لبادہ لے کے آیا ہوں تو اب قد بڑھ گیا ہے

رہ گئی دل میں تمنائے ہم آغوشی بھی
کیا بَلا بحر ہے، یہ بحرِ فراموشی بھی

اے بہت بولنے والے! کوئی سرگوشی بھی
عشق دراصل تکلّم بھی ہے، خاموشی بھی

ہو نہ ہو کوئی نیا روپ ہے عریانی کا
اپنے ہم رنگ لبادے سے بدن پوشی بھی

جانے کیا رنگ دکھائیں گی یہ دونوں اختر
اُس کی آنکھوں کی شفق بھی، یہ بَلانوشی بھی

اک سحرِ تحیّر تھا کہ احساس کی رَو تھی
دِن کو بھی نگاہوں میں شبیہہِ مہِ نو تھی

ہم لوگ تو وابستۂ یک تارِ نظر تھے
معلوم نہیں اِس کے سوا بھی کوئی لَو تھی

تب ذہن پہ ظلمات کا پرتَو نہ پڑا تھا
جِھلمِل تھے کمالات، خیالات میں ضو تھی

پھر خوابِ خرد خوار سے بیدار ہوئے تو
ہر ذہن پہ زنگار تھا، ہر چشم گِرَو تھی

خس خانۂ افکار میں کچھ بھی تو نہیں تھا
چند ایک شرارے تھے اور اُن کی تگ ودو تھی

جانے کس رنگ میں ہو آج کَل اپنا دریا
سُن رہا ہوں کہ ہَوا تیز ہے دریا دریا

تُجھ سمندر کی گھَنی موج تک آتے آتے
مجھ کو رستے میں پڑے ہیں کئی صحرا، دریا

آج بھی وصل کی وہ لہر لیے پھرتی ہے
کس قدر ناز دکھاتا ہے اترتا دریا

لہر لہرائے تو لگتی ہے لہو میں لَو سی
لہلہاتا ہے کسی آئنے جیسا دریا

یہ چنبیلی کے ہیں لہرے کہ بدن کی ململ
*جھلملاتا ہُوا آنچل ہے ترا یا دریا

کیا تلاطم تھے کہ پل میں خس و خاشاک ہوئے
صاحبو! خاک ہوئے دشت میں کیا کیا دریا

کئی پہلو، کئی پرتَو، کئی پیرائے ہیں
عُمر بھر ایک طرف کو نہیں بہتا دریا

عالَمِ نشّہ و حیرت میں کھُلا عقدۂ موج
حالتِ ہوش میں پیدا ہی نہیں تھا دریا

وہ تو بس مصلحتِ خاص تھی اخترؔ، ورنہ
ہم سے ایسا بھی کوئی دُور نہیں تھا دریا

*مستفاد از میر

دِلا! نگاہ ابھی تک ترس رہی ہے وہ خواب
کہیں ڈھلان پہ چلتے ہوئے جو ہم سے گرے

عجب نہیں کہ اُسے بیوگی میں یاد آئیں
وہ آفتاب کہ جو رات کے شکم سے گرے

وجود نے بھی سہارا نہیں دیا اختؔر
ہم ایسے لوگ یہاں زینۂ عدم سے گرے

کس اور لے چلی ہے ہَوائے نمو مجھے
ملتا ہے گام گام اک آشفتہ رُو مجھے

کہنا تو اور کچھ تھا دمِ گفتگو مجھے
اک اور سمت ڈال گئے رنگ و بو مجھے

دونوں ہی درد کیش تھے، دونوں ہی بیش تھے
میں تجھ کو کم سمجھتا رہا اور تو مجھے

بزمِ نمود و نام سجی، شور سا اُٹھا
میں چل دیا کہ راس نہ تھی ہاؤ ہو مجھے

اخترؔ بڑی کڑی تھی مسافت اور اُس کے بعد
مجھ پر کھُلا کہ اپنی ہی تھی جستجو مجھے

اپنے ہمراہ اکیلا ہی چلا جاتا ہوں
کوئی منزل نہیں چلتا ہی چلا جاتا ہوں

دُر سمیٹے تہِ دریا ہی چلا جاتا ہوں
لیجیے، میں پسِ پردہ ہی چلا جاتا ہوں

کوئی نادید ہے جو چشم پہ کُھلتا ہی نہیں
میں کسی سِحر میں کھنچتا ہی چلا جاتا ہوں

یہ رسوماتِ جنوں ہیں کہ علاماتِ خرد
کچھ تو ہے، جانبِ صحرا ہی چلا جاتا ہوں

کچھ نہ کچھ ہوتی ہے تسکین زیادہ نہ سہی
درد بڑھ جائے تو ہنستا ہی چلا جاتا ہوں

استخواں بندیٔ الفاظ تو جانے کب ہو
میں بہر طور بکھرتا ہی چلا جاتا ہوں
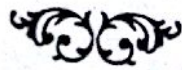
اخترؔ جو کوہِ طُور پہ ہونا تھا ہو چکا
اب کس کے منتظر ہو، بھلا کب کچھ اور ہے

جہان بھر سے جدا، سہل راستے سے پرے
رواں دواں ہوں زمانے کے قافلے سے پرے

تہِ چراغ ہے یہ تیرگی سحر کی دلیل
اک آفتاب ہے ظلمت کے سلسلے سے پرے

ہم اک حجاب کے پیچھے تو دیکھ سکتے ہیں
مگر وہ خواب، جو موجود ہے پرے سے پرے!

یہ تیرگی، یہ پتنگوں کے سوختہ لاشے
تو سامنے ہیں، مگر کیا ہے وہ، دیئے سے پرے

کسے خبر ہے کہ اکثر سوال اٹھتے ہیں
کہے ہوئے سے بہت دُور، "ان کہے" سے پرے

نگاہ آئنہ بینی میں رہ گئی اختؔر
وہ عکس گھومتا رہتا ہے آئنے سے پرے

ابھی خود سے شناسائی بہت ہے
پسِ ادراک تنہائی بہت ہے

چلے ہیں سُوئے مقتل بن سنور کر
ہمیں زعمِ خود آرائی بہت ہے

(جہانگیر عمران کے لئے)

خاک اُڑتی ہے چار سو اے دوست
جانے کس دشت میں ہے تو اے دوست!

پھر وہی میں گزیدۂ محفل
پھر وہی تیری آرزو اے دوست

مجھ سے سُلجھی نہیں ہے زلفِ خیال
ذہن اُلجھتا ہے مُو بہ مُو اے دوست

نکتہ بیں، نکتہ آفریں ہے کون
کیجیے کس سے گفتگو اے دوست!

تُو نہیں ہے تو زہر لگتی ہے
میکدے کی یہ ہاؤہُو اے دوست

کتنے احباب ہیں سرِ مجلس
پر کسی میں وہ خُو نہ بُو اے دوست

میں بھرے میکدے میں تنہا ہوں
کون تنہا کا ہم سبو اے دوست

ہر کسی کی زبان شعلہ فشاں
ہر کسی کا مزاج لُو اے دوست

کچھ میں کچھ کچھ تری شباہت ہے
کون ہے تجھ سا ہُو بہو اے دوست!

جل اُٹھا ہے چراغِ بوسہ پھر
روشنی سی ہے چار سُو اے دوست

نہیں ملنا تو یاد بھی نہیں آ
تارِ احساس بھی نہ چھُو اے دوست

گھُومتا ہوں کسی بگولے سا
جانے کس کی ہے جستجو اے دوست!

وہ تعلّق بھی دھوپ چھاؤں سا
کتنا مبہم تھا اے عدو، اے دوست!

یوں تو اک بار جو بچھڑ جائے
کب ملا ہے مگر کبھو، اے دوست!

اے قرارِ دل و نگاہ، بیا
زخم داریم بی رفو اے دوست
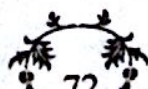
ق

آج ہے کس کی آبرو اے دوست!
شہر کا شہر تند خو اے دوست

کچھ ہیولے ہیں ہر طرف رقصاں
کوئی غوغا ہے کُو بہ کُو اے دوست

ہر کوئی زیرِ سایۂ شمشیر
ہر کوئی طوق دَر گُلو اے دوست

شہر دامان و دِل دریدہ ہے
ہر کوئی ہے لہو لہو اے دوست

پائمالی سی پائمالی ہے
باغ کا باغ بے نمو اے دوست

رنگِ امکاں نظر نہیں آتا
سنگِ زنداں ہے ہر طرف اے دوست

آ، کہ روشن کریں چراغ سے
شام بھی ہے لہو لہو اے دوست

آئنے پھیل گئے ہیں مری آنکھوں کی طرح
چار جانب مرے خوابوں کی فضا پھیل گئی

میں ترے بعد مسلسل ہی بگولوں میں رہا
گرد بیٹھی تو جدائی کی ہوا پھیل گئی

پڑاؤ کرنا نہیں انتہائے عرفاں تک
گرفتِ خواب میں جانا ہے حدِّ امکاں تک

مری نگاہ میں کچھ اور شش جہات بھی ہیں
جنوں نہیں ہے فقط وسعتِ بیاباں تک

مرے وجود میں مخفی ہیں موج موج بھنور
مجھے تموّجِ مژگاں سے دیکھ طوفاں تک

دامنِ چاک مرے ہاتھ میں تھا ڈوبتے وقت
بادباں تیز ہَوا نے ہی بدلنے نہ دیا

مطلعِ صبح سے ہر شعر کی باندھی ہے ردیف
میں نے خورشید کبھی پہلے نکلنے نہ دیا

میں دیکھ ہی رہا تھا کہ یکدم بھنْور پِھرا
گھُوما صدف نگاہ میں، اُس میں گہر پِھرا

سیدھے سبھاؤ زیست سمجھنا محال ہے
اِس کام کو بھی چاہیے مجھ سا ہی سَر پِھرا

ہم تو سدا سے بستۂ یک تارِ چشم ہیں
خدشہ سا تیری سمت سے ہے، تُو اگر پِھرا

یکدم کسی کی یاد میں آنکھیں بھر آئی تھیں
اک دن یونہی خیال سُوئے چشمِ تر پِھرا

اختر زرِ سخن کی کسی کو طلب نہیں
میں تو اِسے اٹھائے ہوئے دَربدر پِھرا
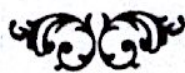
میں بے پناہ سہی، پر نہیں کمی کے بغیر
محال ہے کہ خوش آئے خوشی، غمی کے بغیر

لہو میں لَو سی لگائے ہوئے ہے مدّت سے
بھڑک رہا ہے جو شعلہ سا برہمی کے بغیر

ابھی تلک وہ گُلِ نیم شب میسّر ہے
پہ اس طرح کہ تب و تابِ شبنمی کے بغیر

میں وضعدار عزادار تھا کہ مجلس میں
بہت ہی ٹوٹ کے رویا مگر نمی کے بغیر

یہ رنگِ حُزن، یہ اسلوبِ یاس بھی کب تک
کبھی اک آدھ غزل طرزِ ماتمی کے بغیر

مجھ کو زنداں میں بھی وحشت ہے بیاباں جتنی
کیا کیا جائے کہ دنیا نہیں امکاں جتنی

اور پیچیدہ ہوئی جاتی ہے یہ پیچ بہ پیچ
زیست آساں نہیں لگتی ہے یہ آساں جتنی

اصل میں فرق ہے بس پھیلنے، لہرانے کا
دیکھنے میں تو ہے جھولی بھی گریباں جتنی

ایک تنہائی سی ہے خانۂ دل میں اختر
اک [illegible] ہے یہاں شہرِ خموشاں جتنی

ہم ایک عُمر سے ہیں روگ کیا لگائے ہوئے
زمانہ بیت گیا قہقہہ لگائے ہوئے

یہ کچھ لگائے ہیں ہم نے پئے نمائشِ عام
کچھ اور پھول ہیں دِل میں جُدا لگائے ہوئے

اُڑی اُڑی ہے گُلِ نو شگفتہ کی رنگت
ابھی گئی ہے صبا دِل سے کیا لگائے ہوئے!

ستم کے نام ہی سے مشتعل ہے
خدا بھی جیسے کوئی اہلِ دل ہے
ہَوا آزادِ خال و خد ہے اختر
اِسی باعث عدوئے آب و گِل ہے

اب نئے رنگ، نئی راہ پر آیا ہوں میں
قریۂ دیدہ و دل سے گزر آیا ہوں میں

سَرِ افلاک گیا اور اتر آیا ہوں میں
مادرِ خاک! اِدھر دیکھ، گھر آیا ہوں میں

جاتے جاتے بھی مرے ساتھ رہیں روشنیاں
آتے آتے بھی کئی دیپ دھر آیا ہوں میں

کوئی باعث تو ضروری ہے پئے نقش گری
کوئی امکان تو ہوگا اگر آیا ہوں میں

خود سے نکلا تو عجب حال تھا بیرونِ بدن
حیرتیں ساتھ لیے خود میں در آیا ہوں میں

مجھ کو پہچان سکیں کب مری تصویریں بھی
کوئی بہروپ، کوئی سوانگ بھر آیا ہوں میں

جو بھنْور بیڑیاں بنتے رہے، جو طوق ہوئے
سب شکستہ ہیں، انہیں توڑ کر آیا ہوں میں

کِھلکِھلاتے ہوئے بچّے، سَر اُٹھاتے ہوئے پھول
جانے پھر باغ سے کیوں چشم تر آیا ہوں میں!

6

دل و دماغ سے اُس کا خیال اگر نکلے
یہی ہے ایک رہِ اعتدال، اگر نکلے

بَلا کا روگ ہے تہہ داریٔ تجسّس بھی
سوال اور اُٹھیں اک سوال اگر نکلے

زمیں پہ جس نے بُلایا دکھا کے دانہ و آب
ستم ہے اُس کی بغل سے بھی جال اگر نکلے

محال ہے اُسے گھر سے نکالنا اخترؔ
کسی طرح اُسے دِل سے نکال اگر نکلے
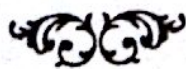
باتوں سے شکستہ نہ ہوئے سلسلے گُن کے
پھر آئنہ ترتیب دیا کرچیاں چُن کے

ہر سوختنی اصل میں آموختنی ہے
پروانہ گُلِ نار ہُوا آگ میں بُھن کے

اک طعنۂ خلقت کہ بہر گام تھا حائل
پر ہم بھی غرض دار تھے چلتے رہے سُن کے

اب تک وہی رونا ہے غریب الوطنی کا
اب تک فلک آثار محلّات ہیں اُن کے

مٹّی بھی میسّر تھی ہمیں چاک بھی اختر
اِس پر بھی تمنّائی تھے آوازۂ کُن کے

ہم دہرِ ناشناس میں اپنی سی کر چکے
مشکل ہے ایک عمر میں قرضِ ہُنر چکے

اپنی گرہ میں دامِ ندامت ہے ، اور کیا
بے مائیگی میں قیمتِ جنسِ نظر چکے !

اب ذہن میں وہ ضو ہے، نہ ویسی لہو میں لَو
ہر موج خاک ریز ہے دریا اُتر چکے

وجود ملنے پہ بھی کیا وجود میں آیا
مری جگہ، مرا سایہ وجود میں آیا

بہ سطحِ چرخ بہت کی خمیر نے گردش
بڑے عذاب سے کُوزہ وجود میں آیا

نظر غیاب کو سطحِ شہود پر لائی
جہاں میں جو بھی عدم تھا، وجود میں آیا

جہاں پہ دفن ہوئی موجِ بے قرار کی لاش
اُسی مقام پہ دریا وجود میں آیا

فریب خانۂ دنیا بھی دیکھتے چلیے
روا روی میں تماشا بھی دیکھتے چلیے

خود اپنا مسکنِ فردا بھی دیکھتے چلیے
اب آ گئے ہیں تو صحرا بھی دیکھتے چلیے

نجانے پھر یہ تلاطم نصیب ہو کہ نہ ہو
اس اَوجِ موج میں دریا بھی دیکھتے چلیے

بقدرِ سیریٔ عرفاں کوئی بھی رنگ نہیں
دُکانِ زیست کو جتنا بھی دیکھتے چلیے

چراغِ نقشِ کفِ پا جلایئے ہر سُو
مگر ہَوا کا اشارہ بھی دیکھتے چلیے

کچھ کوس تمہاری ضو میں کٹے، کچھ اور مہِ دل کی لَو میں
دم بھر کو بھی نہ پڑاوَ کیا چلتے رہے منزل کی لَو میں

لگتا ہے کہ اصلِ یزداں بھی اک شکل ہے اصلِ انساں کی
وہ جوہرِ نُور چمکتا ہے اِس کالبدِ گل کی لَو میں

کیا اہلِ خرد، کیا اہلِ جنوں، گویا کہ فریب وسراب میں قید
اک دل کی لہر میں چلتا ہے اور ایک دلائل کی لَو میں

جب جگر جگر تلواروں میں جنگاہ بھی جگمگ جگمگ ہو
کچھ اور بھڑ کنے لگتے ہیں جذبات جلا جل کی لَو میں

ممکن ہی نہیں ہے ظلمتِ شب وحشی سے اجالا چھین سکے
* ہر شام دمکنے لگتا ہے زندان سلاسل کی لَو میں

*مستفاد از فیض

میں اپنی پہچان بھی عجائب گھروں میں دیکھوں
عدو کے گھر میں مرے حوالے پڑے ہوئے ہیں

نگر میں صحرا نورد سایہ سا گشت میں ہے
اسی لئے تو گھروں پہ تالے پڑے ہوئے ہیں

توے کے تارے پلک جھپکتے ہی بجھ گئے ہیں
فلک پہ اختر کو جاں کے لالے پڑے ہوئے ہیں
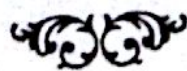
بینائیوں میں، روح کی گہرائیوں میں رات
آباد ہو گئی مری تنہائیوں میں رات

گُرگ آشتی کی رسم سے واقف نہیں ہوں میں
یوسفؑ نہیں کہ کاٹ سکوں بھائیوں میں رات

دنیا کی دوڑ دھوپ میں دوپہر کٹ گئی
یاروں میں شام بٹ گئی، بلوائیوں میں رات

وہ درد ہی نہیں جو شفایاب ہو سکے
سو مجھ سے بڑھ گئی ہے توانائیوں میں رات

عثمانؔ ایک عُمر سے اوقاتِ شہر ہے
سایوں میں دن گزارنا، پرچھائیوں میں رات

جو گُل سرِ شاخِ دِل کِھلایا
کُمہلانے لگا تو کِھلکِھلایا

بھڑکائی ہے اُس نے آتشِ زخم
باغنچۂ مشتعل کِھلایا

افلاک پہ کہکشاں کِھلائی
مٹّی میں دِلِ خجل کِھلایا

مژگان پہ تو کھلائے جگنو
رخسار پہ ایک تِل کھلایا

اے مادرِ خاک! تو نے مجھ سے
بیکار کو مستقل کھلایا

اک پھول بنامِ کُفر ہم نے
ایمان سے متّصل کھلایا

کہیں بھی کیا سخنِ نارسا کے ہوتے ہوئے
چراغ چُپ ہیں ترے نقشِ پا کے ہوتے ہوئے

نہ یاد آیا ہمیں برقِ تیز رَو کا مزاج
نگاہ میں کسی شعلہ ادا کے ہوتے ہوئے

غلاف میں بھی وہ تلوار بے غلاف لگی
تمام نقش عیاں تھے قبا کے ہوتے ہوئے

نجانے کون سی مٹّی کے لوگ ہیں اختر
خموش ہیں جو سَروں میں ہَوا کے ہوتے ہوئے

تجھے پھر سے سرِ کوہِ تمنّا دیکھنے کا
ذرا سا بھی نہیں امکان ایسا دیکھنے کا

ابھی ذہن و نظر زنگار کے زیرِ اثر ہیں
کوئی پہلو نہیں ہے سوچنے کا، دیکھنے کا

خزاں خواہوں نے اِس میں سبز شیشے جڑ دیے ہیں
ہمیں خوش فہم ہی رکھتا ہے چشمہ، دیکھنے کا

کچھ اُس کے جسم کی وہ شعلگی بھی بُجھ گئی تھی
کچھ اپنا شوق بھی ویسا نہیں تھا دیکھنے کا

بوقتِ آئنہ بینی پلک جھپکی تھی اخترؔ
تغافل میں گنوا بیٹھا ہوں لمحہ دیکھنے کا

Scanned by CamScanner

ہر نیا رنگ، نیا روپ دکھاتی ہے مجھے
زندگی جیسے مکمّل کیے جاتی ہے مجھے

جانے کس خِطّہٗ اضداد سے ہے میرا خمیر
آگ میں کانپتا ہوں، برف جلاتی ہے مجھے

ہنستے ہنستے یونہی یکبار میں رو دیتا ہوں
روتے روتے یونہی یکدم ہنسی آتی ہے مجھے

سیلِ وقت سے خود کو دُور جب کھڑا دیکھا
اپنی سمت اک عالَم دیکھتا ہُوا دیکھا

لاکھ لاکھ جلوے تھے راکھ راکھ شکلوں کے
کیا تجھے بتائیں اب، کس کو ہم نے کیا دیکھا

حُسن اور عالَم تھا، عشق اور دنیا تھی
سو وہاں سے اُٹھ آئے، اپنا راستہ دیکھا

ساتھ ساتھ چلتے ہیں سلسلے خرابی کے
ہم نے خواب محلوں کو بنتا ٹوٹتا دیکھا

سال کٹ گئے کتنے شعر کے ریاض اندر
تب کہیں بیاض اندر لفظ بولتا دیکھا

غریقِ خواب ہوں یا جاگتا ہوں
کچھ ایسا ہے کہ سوتا جاگتا ہوں

ابھی سے لوگ طنز آور ہیں تجھ پر
ابھی تو میں بھی جیتا جاگتا ہوں

شبِ ہجراں تجھے معلوم کب ہے
میں تیرے ساتھ کب کا جاگتا ہوں

جگانے جب کوئی آتا ہے اختر
تو کہہ دیتا ہوں ''اچھا جاگتا ہوں''

ترے ضمیر کا گھاؤ تو بھر گیا ہوں میں
غلافِ زخم تھا، آخر اتر گیا ہوں میں

وہاں پہ بکھرا پڑا ہے بڑے بڑوں کا غبار
یہ جان بوجھ کے اُس راہ پر گیا ہوں میں

یہ آرزو تھی کہ آزردۂ جہاں سے ملوں
جو میں نے آئنہ دیکھا تو ڈر گیا ہوں میں

کسے مجال کہ میرا جمال دیکھ سکے
اُتر کے دار سے ایسا نکھر گیا ہوں میں

کلی چٹکنے کی آواز بَین جیسی ہے
بَلا کا شور ہے، لگتا ہے مر گیا ہوں میں

کچھ سائے تھے، کچھ آنکھیں تھیں، اک تارا تھا
اِس دریا کے اُس پار کہیں اک تارا تھا

وہ دُور جہاں اب مجلسِ غم ہے سجی ہوئی
اور منظر ہے خونناب، وہیں اک تارا تھا

ہم جس کی کرنیں سینت کے دل میں رکھتے تھے
وہ سُورج سا کچھ اور نہیں اک تارا تھا

اب صرف گماں پر گُنبدِ گردوں قائم ہے
کچھ پہلے تک بھرپور یقیں اک تارا تھا

جو بھر گئے کون شمار کرے اُن زخموں کو
اک آئینہ، اک سُرخ نگیں، اک تارا تھا

جوگی تھے سائیں مرنا بھی اور اختر بھی
اک تارا تھا، اک ہاتھ حسیں اکتارا تھا

قحطِ ندا کی رُت میں غنیمت ہے بازگشت
عرصہ ہُوا ہے اصلِ صدا سے جدا ہوئے

ہم گریزاں نہ ہوئے تیری طلب سے اب تک
ایک ہی دُھن میں چلے جاتے ہیں جب سے اب تک

ایک لمحے کو ہی چمکی تھی کوئی برقِ بدن
ہم وہ کُشتہ ہیں کہ نکلے نہیں چھَب سے اب تک

اک اداسی ہے کہ ہمراہ چلی جاتی ہے
ہم شناسا بھی نہیں جس کے سبب سے اب تک

جانے کیا دیکھ لیا تھا پسِ دیوارِ خیال
اک تب و تاب لیے پھرتی ہے جب سے اب تک

تیرگی خواب ہوئی، صبحِ فروزاں آئی
لیکن اک سوچ ہے لپٹی ہوئی شب سے اب تک

دیدہ و دِل کسی مصرع پہ ٹھہرتے ہی نہیں
ایسے لگتا ہے کہ یہ لفظ ہیں اب سے اب تک

پھر اُتارے گا وہ افلاک سے خاک
لے گیا قریۂ خاشاک سے خاک

بطنِ انساں سے بھی انساں نکلا
گویا تخلیق ہوئی خاک سے خاک

آدمی بکھریں، فرشتے جل جائیں
خاک سے راکھ جڑے، راکھ سے خاک

کوئی تو ٹوٹ گیا ہے اوپر
کیوں برسنے لگی افلاک سے خاک!

دھند یا دھول نظر آتی ہے
آ لگی دیدۂ نمناک سے خاک

کوئی جب اِس کو نہیں گوندھ سکا
کیسے منسوب رہے چاک سے خاک

اپنے جیسوں سے مِلا ہوں اختر
کب جدا ہے خس و خاشاک سے خاک

نگاہ سینت کے رکھ لمحۂ تماشا ہے
پھر اس کے بعد عجب نشّۂ تماشا ہے

کوئی دھواں ہے کہ رِستا ہے میرے زخموں سے
مرا چراغِ بدن کُشتۂ تماشا ہے

مری تلاش میں ہے دیدۂ تماشا بھی
مرے طواف میں آئینۂ تماشا ہے

ہنوز لذّتِ سیرابیٔ وفور نہیں
ہنوز چشمِ طلب تشنۂ تماشا ہے

نہیں ہے کوئی تماشا بقدرِ سیریٔ چشم
ترا جمال بھی یک ریزۂ تماشا ہے

دم بدم خوار پھروں، کوئی تماشا بن جاؤں
شہر میں گرد رہوں، بَن میں بگولا بن جاؤں

میں کہ خود رفتہ ہوں، کچھ مجھ پہ نہیں زور مرا
اب تو اُس دستِ ہُنرور پہ ہے، میں کیا بن جاؤں

ساز و آواز ہیں، دونوں جو کبھی مل جائیں
تُو ادھورا نہ رہے اور میں پورا بن جاؤں

کچھ نہ کچھ مجھ کو، نگاہِ غلط انداز! بنا
کچھ نہ بن پاؤں تو پھر تیرا نشانہ بن جاؤں

جوڑ توڑ اور بڑھا جاتا ہے اختر عثمان
کیا عجب ہے کہ یونہی ٹوٹتا بنتا، بن جاؤں

وصل بھی کیا ہے، بس آتش سی بھڑک جاتی ہے
اک لپک آئنے سے آئنے تک جاتی ہے

نِت نیا بھیس بدلتی ہے عروسِ تخلیق
اور اُترن مرے احساس میں رکھ جاتی ہے

اک ہَوا آ کے اگر جھاڑتی ہے گَردِ قبور
اک ہَوا آ کے اِنہیں خاک سے ڈھک جاتی ہے

اک نہ اک دن تو ملے گا کسی منزل کا سراغ
جان ہی لیں گے کہاں گُل کی مہک جاتی ہے

کسی سے خوف نہیں ہے ترے جہاں میں مجھے
جہاں پناہ! تجھی سے پناہ چاہتا ہوں

دیئے کی لاٹ نہیں، تُو ہے جستجو میری
میں روشنی کے بجائے نگاہ چاہتا ہوں

وفورِ نشّہ، لغزش سے چُور ہوں اخترؔ
جو آدمی ہوں تو اِذنِ گناہ چاہتا ہوں

کیا کیا ضرورتوں سے فزوں کھا گئی ہَوا
کم پڑ گئی خرد تو جنوں کھا گئی ہَوا

اب اِنہدامِ قصرِ تخیّل کا وقت ہے
گن گن کے، ایک ایک ستوں، کھا گئی ہَوا

ہم تو سدا سے خاک تھے، خوراکِ خاک تھے
دورِ ہَوا سرشت کو کیوں کھا گئی ہَوا

کیا داستانِ عہدِ گذشتہ رقم کریں
وہ خواب، وہ نشہ، وہ فسوں کھا گئی ہَوا

صَر صَر صفت خیال ہیں، لب سوختہ سوال
ہر آدمی کا سوزِ دروں کھا گئی ہَوا

کیا پھیلائے پر اور پاؤں، کیونکر بانہیں کھولے!
جو پنجرے کا پنچھی ہو، پنجرے میں آنکھیں کھولے

اِتنی تنگ فضا میں میرے جوہر کیسے جاگیں
میرے آگے گردُوں اپنی پوری پرتیں کھولے

کیا پسپائی، کون رسائی، خواب سَرا پر تالا
اب تو اپنے سَر کا سودا ہی دیواریں کھولے

اخترؔ اپنی فطرت میں ہے دریا دِل درویشی
اپنے فن کے بھید بھنْور بھی اپنے مَن میں کھولے

سب کے آئینۂ احوال میں آباد رہوں
شاید ایسی ہی کسی بات سے کچھ یاد رہوں

میں وہ طائر کہ جو پنجرے سے رہائی بھی ملے
پر نہ کھولوں، یونہی وابستۂ صیّاد رہوں

اِتنی فرصت نہیں سوچوں کہ مجھے رنج ہے کیا
یہ بھی اچھّا ہے کہ یوں رنج سے آزاد رہوں

اُس ابدتاب کی چھَب ہے ہمہ خوشبو، ہمہ رنگ
اک جھلک دیکھ کر اُس کو ہمہ تن شاد رہوں

پئے تعمیر بھی تخریب ضروری ہے سو میں
کچھ بنانے کی تگ و تاز میں برباد رہوں

زمیں سے ہے طلب اِشتراکِ درد مجھے
بھلا بچائے گا کیا چرخِ لاجورد مجھے!

مجھے نہیں کفن و دفن کی کوئی خواہش
یہ کام گرد کا ہے، ڈھانپ لے گی گرد مجھے

کوئی شرارِ جنوں ہے نہ شعلۂ وحشت
دکھائی دیتے ہیں صحرائی سَرد سَرد مجھے

درونِ جسم الاؤ تھے یوں تو کتنے ہی
غزل کی شکل میں ڈھل پائے چند شعلے ہی

کہ مضطرب تھے سَرِ چرخِ کُوزہ گر ہم لوگ
سکوں کا سانس لیا چاک سے اترتے ہی

یہ مستزاد کہ بھڑکا دیا کسی نے اُسے
وہ بدگماں تھا ہماری طرف سے پہلے ہی

نئی نہیں ہے ہمارے لئے خزاں کی خبر
ہمیں تو دھڑکا لگا تھا بہار آتے ہی

نہیں کہ صرف ہمیں ہیں شکارِ گردشِ دہر
یہاں ہماری طرح جی رہے ہیں سارے ہی

ہر کوئی تاثّر کھو بیٹھا ہستی پہ اثر کرتے کرتے
پتھرا گئیں میری آنکھیں بھی پتّھر کو گہر کرتے کرتے

یہ حیات ہے رسمِ کوہ رسی جو نبھاتے جوکھوں جان پھنسی
مری سانسیں ٹوٹ نہ جائیں کہیں یہ بلندی سَر کرتے کرتے

اب شوقِ فروغِ خواب نہیں، ترویجِ جنوں کی تاب نہیں
میں اپنی خبر سے ٹوٹ گیا دنیا کو خبر کرتے کرتے

وہ سکون کہاں، وہ جنون کہاں، خاموش رگوں میں خون کہاں
اے دھرتی! نہریں سُوکھ گئیں تری فصلیں تر کرتے کرتے

مری آنکھیں ہیں ایسی خاک پر بھی
جو روشن ہے ترے افلاک پر بھی

اگر ہے تو زمیں پر بھی اُتر آ
کبھی آ نکتۂ ادراک پر بھی

یہاں آ کر بھی زور آور وہی ہیں
وہی قابض ہوئے املاک پر بھی

تو وہ گھر بھی جلا دے گا ہمارے!
تو غصّہ ہے خس و خاشاک پر بھی!

کہیں پرتَو مرا ہی تو نہیں ہے
یہ میں ہی تو نہیں افلاک پر بھی!

جنونِ شش جہت سازی میں اخترؔ
جہاں تشکیل ہو گا چاک پر بھی
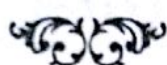
میسّر آیا نہیں اُس کشادہ دِل کا وصال
میں خاک ریز ہُوا لہر لہر بہہ کر بھی

میں اُس کی بُوئے خوش امکان کے خمار میں ہوں
کہ مجھ میں کوئی مہکتا ہے مجھ سے بہتر بھی

ہماری عمر میں جو صدمۂ گل کھینچتا ہے
وہ کوزہ گر بہت مشکل مراحل کھینچتا ہے

اِدھر ہم ہیں، مذاقِ تابِ نظّارہ کے مارے
اُدھر اک آئنہ ہے، جو مقابل کھینچتا ہے

طنابِ خیمۂ اعصاب ہے بس ٹوٹنے کو
جنوں جوبن پہ ہے، قیدی سلاسل کھینچتا ہے

کسی کو دیکھتے ہی، ہاتھ پھیلاتا ہے اپنے
کسی کو دیکھتے ہی، ہاتھ سائل کھینچتا ہے

کوئی سیلِ نفس میں ڈوبتا جاتا ہے اختر
کوئی تنہائی میں بھی لطفِ محفل کھینچتا ہے

طرح طرح کے مسائل میں ایک سائل ہوں
کُھلا کہ میں کسی لاحاصلی کا حاصل ہوں

ہے اختیار بجائے خود ایک صورتِ جبر
میں اِس رہائی میں بھی بستۂ سلاسل ہوں

مرے خمیر میں گوندھا ہُوا ہے ذوقِ سفر
یہی بہت ہے کہ ناآشنائے منزل ہوں

ضرور آئے گا اب کوئی گفتگو کرنے
میں اُس کے آنے سے پہلے کا شورِ محفل ہوں

مرے نقوش جھلکتے ہیں سب کی صورت میں
میں سب سے دُور ہوں لیکن میں سب میں شامل ہوں

ہر ذرّۂ پُرنور کہ ہو چاہے کہیں کا
مرہونِ تب و تاب ہے اُس مہرِ مبیں کا

کیا کیا نہ اُٹھا شور پسِ پردۂ تحریر
پر ذہن عبارت میں رہا حاشیہ بیں کا

یک پارچۂ گل سے ہوئی دہر کی تجسیم
خود اصل سے اِنسان ہے پیوند زمیں کا

گرتی ہوئی دھیان پڑی تھی دستار کھڑے پانی میں
اک عمر کٹی خودگرداں تب آئے بڑے پانی میں

جب آنکھ میں نیلم پگھلا، پَو پھوٹی پربت پربت
جذبوں میں جوالا جاگی اور پھول پڑے پانی میں

پھر پات پڑے پیپل پر، آکاش پہ تارے چمکے
کچھ سُوکھ گئے ٹہنی پر، کچھ آن جھڑے پانی میں

ہر لہر لہو میں تر ہے، گرداب کشیدہ سَر ہے
گھمسان پڑا پانی کا، دو عکس لڑے پانی میں

نادان تھیں ناریں اختر گھر گارا لے آئی ہیں
اک موج میں سب نے تہہ تک ڈالے تھے گھڑے پانی میں

تا کہ سب کچھ دکھائی دے شفّاف
کوئی بدلے یہ آئنوں کے غلاف

کون ہستی کو جان سکتا ہے!
سیرِ دنیا بھی ہے خودی کا طواف

کون دیکھے گا دوسری جانب!
کون سوچے گا آپ اپنے خلاف!

پیشِ آئینہ یہ مری آنکھیں
جیسے پانی میں پڑ گئے ہوں شگاف

پرائے سائے سے خائف ہوں، چھت سے ڈرتا ہوں
نیا نیا ہوں، ابھی مصلحت سے ڈرتا ہوں

ترے قریب نہیں ہوں تری بھلائی میں
میں آفتاب ہوں، ہر تیخ صفت سے ڈرتا ہوں

یہ پیچ پیچ سفر اور مجھ سا ہیچ ہُنر
یہ خم زیادہ ہیں میری سکت سے، ڈرتا ہوں

نجانے کب یہ مجھے کیسے منعکس کر دے
نگاہِ آئینۂ کم جہت سے ڈرتا ہوں

کس طرف ہیں مرے سب دشمنِ جاں، سب مرے دوست!

اس خرابے میں کہیں بھی تو نہیں اب مرے دوست

دل پہ بڑھتی ہوئی ظلمت کا فسوں طاری ہے

جانے کب لوٹ کر آئیں مرے ہم شب، مرے دوست

کس تعلّق سے پکاروں دمِ تنہائی تجھے

مرے خوش رُو، مرے خوش بو، مرے خوش لب، مرے دوست!

عالمِ مرگ میں ہستی کی ہَوا آتی رہے
حشر کے بعد بھی ممکن ہے قضا آتی رہے

کوئی ہمسر تو کُجا، ثانیٔ یک ریزہ نہیں
پھِر بھی کچھ کہتے ہوئے خود سے حیا آتی رہے

ہم تو آتے ہی رہیں گے سَرِ دربار وصال
اے شبِ ہجر! اگر تو بھی سدا آتی رہے

اپنے ہر زخم سے اُٹھتی رہیں موجیں پیہم
موجِ خوں ریز جُدا، آگ جُدا آتی رہے

کیا خبر ہے کہ سَرِ کوہ تکلّم اختر
کوئی موجود نہ ہو اور صدا آتی رہے

پتّھروں کو خلعتِ احساس پہناتا ہوں میں
کارِ آئینہ گری میں ٹوٹتا جاتا ہوں میں

میں کہ اک مدّت سے ہوں غوطہ زنِ بحرِ فنا
دیکھئے اُبھرے پہ آخر کیا گہر لاتا ہوں میں

مائلِ معدومیٔ ہستی ہوں جیسے ریگ مال
دُوسروں کے زنگ پر گھستا چلا جاتا ہوں میں

وقت پڑ جائے تو اپنے خون سے بُجھتی ہے پیاس
بھوک بڑھ جائے تو اپنا ماس بھی کھاتا ہوں میں

جو صرف ہونٹ ہلاتا ہے آئنے میں ہے
میں بولتا ہوں مگر آئنے سے باہر ہوں

یہ پیش پائی کہ پسپائی ہے نہیں کھُلتا
ورا ہوں خود سے مگر خود کو بھی میسّر ہوں

میں اک طرف ہوں، مرا عکس دوسری جانب
کوئی بتاؤ! یہ کہتر ہے یا میں بہتر ہوں

کسی نگاہ نے ایسے طلسم باز کیے
میں رنگ دیکھتا جاتا ہوں اور ششدر ہوں

کس طَور سے یہ فلک پِھرا ہے
ایقان پہ خطِّ شک پِھرا ہے

کھا کھا گیا فصل واہموں کی
کھیتوں میں عجب نمک پِھرا ہے

کچھ ہو تو اسے تلاش پائے
تخئیل تو دُور تک پِھرا ہے

کچھ میں ہی نہیں نگاہ دیدہ
پانی سا پلک پلک پھِرا ہے

اک عارض و لب کی آگ لے کر
وہ شوخ لپک لپک پھِرا ہے

کیا کیا وہ عیاں ہُوا ہے اختر
آنکھوں میں جھلک جھلک پھِرا ہے

ہم پہ ہی ختم ہوئی صنعتِ آئینہ گری
ہم سے ہی سنگ کو پیراہنِ احساس مِلا
تیشۂ شوق تو اک عُمر میں پھل دیتا ہے
کوہ کاٹے تو کہیں ریزۂ الماس مِلا

(اشرف سلیم کے لئے)

جہان بھر کو سرِ نوکِ پا لیے ہوئے ہیں
بَلائیں دور کہ اِس وقت ہم پیے ہوئے ہیں

بس اب اِسے تُو کسی اور کے حوالے کر
یہ زندگی تو کئی بار ہم جیے ہوئے ہیں

ذرا سلیقہ بخیہ گری تو دیکھ اے دوست!
ترے لگائے ہوئے زخم خود سیے ہوئے ہیں

یہ تار تار گریباں، یہ لڑکھڑاتی زباں
عزیز ہیں کہ یہ تحفے ترے دیے ہوئے ہیں

شراب پی کہ ترا اندرون صیقل ہو
اِدھر بھی دیکھ، یہ دل آئنہ کیے ہوئے ہیں

یوں نہ اے نسترن اندام! حذر کر مجھ سے
پھُول میں باس اترتی ہے سنور کر مجھ سے

ہو کے خود رفتہ و بے خود کسی دریا کی طرح
آ، کسی شام کو مِل، مجھ میں اُتر کر مجھ سے

نقش آرائی ہے یا جوہرِ ترتیبِ خطوط
عکس آئینے میں جاتے ہیں گزر کر مجھ سے

میں وہ رہرو جو ہم آہنگ کسی سے نہ ہُوا
میرا سایہ بھی جُدا ہو گیا ڈر کر مجھ سے

وہ بھی میری ہی طرح تھا کوئی سیماب مزاج
صبح آئی تو کہیں چل دیا بھر کر مجھ سے

ہم سے ہوئی نہ پرورش سلسلۂ کمال کی
آج بھی چرخِ فکر پر خاک ہے اک سوال کی

کس کی مجال دیکھتا ایک جھلک جمال کی
سِحر سوا وصال کا، جوت جُدا جلال کی

حُسن کے خال خال کو لفظ میں ڈھال ڈھال کر
سوچتا سَر ڈھلک گیا، بجھ گئی لَو خیال کی

آج بھی آنکھ نم کرے، آج بھی خوں میں رم کرے
خواب کسی خیال کا، یاد کسی غزال کی

رشکِ عقیق جسم تھا گویا کوئی طلسم تھا
شعر سا کوئی اِسم تھا جس نے غزل بحال کی

وہ غمزہ ہائے دلآویز، وہ کنائے ترے
خیال جتنے مسافت میں آئے، آئے ترے

نہ بولتا تو مناسب تھا غنچۂ سادہ
ہنسی ہنسی میں صبا نے سخن چُرائے ترے

کہاں کی دُھوپ، کہاں کی گھٹا، کہاں کی ہَوا
ترے فقیر تو پھرتے ہیں سائے سائے ترے

شفق لہو میں گُھلی، لَو لگی خیالوں میں
افق سے دُور کہیں ہونٹ جِھلمِلائے ترے

(اختر شمار کے لئے)

نمو کا رنگ آوازِ صبا ہے
نظر والوں سے منظر بولتا ہے

کوئی لَو سی لپکتی ہے لہو میں
کہیں اک پھول سا کھِلنے لگا ہے

ابھی سانسوں میں ہے خوشبو نمی کی
ابھی مٹّی میں پانی جاگتا ہے

ابھی خس خانۂ خواہش میں ہے کچھ
کہیں اک ولولہ لَو دے رہا ہے

ہمارا عالمِ حیرت ہے دیگر
ہمارا آئنہ خانہ جُدا ہے
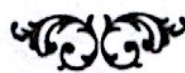
فقط اک مصرعِ ہستی کہا ہے
اور اُس میں بھی شکستِ ناروا ہے

رگوں میں رینگتی ہے دھوپ، جیسے
کوئی سورج لہو میں تیرتا ہے

عجب سا کرب ہے یہ کربِ تخلیق
یہ دروازہ کسی دیوار سا ہے

عروسِ حرف سے بنتی ہے اپنی
مگر وہ بھی تغافل آشنا ہے

گُلِ ناآفریدہ تھا وہ مصرع
سرِ شاخِ تخیّل جو کِھلا ہے

وہی احساس جو ایمان تھا، ہے
ابھی تھوڑی بہت سر میں ہوا ہے

مری آنکھیں بہت کچھ سُن رہی ہیں
تری آواز تک جلوہ نما ہے

وہی شوقِ کشودِ سِرِّ حیرت
وہی سودا کہ اِس کے بعد کیا ہے!

نظر میں چھا رہی ہے سرمگیں شام
تری آنکھوں میں کاجل پھیلتا ہے

نہیں، میں گرنے والوں میں نہیں ہوں
نہیں، میرا جنوں تیغ آزما ہے

ہمیں رستہ سُجھائی دے رہا ہے
ترا نقشِ کفِ پا جاگتا ہے

کوئی سودا سا ہے خودیافتی کا
تجسّس ہر گلی میں گھومتا ہے

دل و جاں پھر معطّر ہو رہے ہیں
کوئی پھر سے دریچے کھولتا ہے

جہاں میں جس طرف، جو آئنہ ہے
ہیولے منعکس کرنے لگا ہے

دیارِ دِل ترا ایسے دمکنا
یقیناً ظلمتِ نو کی بِنا ہے

اچانک بُجھ گئی طبعِ فروزاں
بدن میں پھر اندھیرا چھا گیا ہے

لہو میں روشنی ہووے نہ ہووے
مگر پندار سب کا مسئلہ ہے

جو آنسو آنکھ سے دِل میں گرا تھا
ذرا دیکھو تو گوہر ہو چکا ہے

ذرا سنبھل کے، یہاں آہٹوں پہ پہرا ہے
سماعتیں ہیں کہ ننھّی ہیں چاپ چاپ کے ساتھ

فراتِ نو جو اُبلتا رہا یونہی کچھ دن
تو سب کو پیاس بجھانا پڑے گی بھاپ کے ساتھ

ہم سے ہی عام ہوئی صنعتِ دریوزہ گری
ہم نے پوشاکِ سفارت میں سوالی بھیجے

اُس نے اِس بار تو حد کر دی ہے اختر عثمان
اُس نے اِس بار تو کشکول بھی خالی بھیجے

بدن کی خاک سے لپٹیں گی پھر زہرہ کی بانہیں
زمیں نے آسماں سے رابطے رکھے ہوئے ہیں

اُگائیں گے جو بستی میں نئی سوچوں کا سورج
ہَوا نے ایسے ایسے سر پھرے رکھے ہوئے ہیں

حیرتیں گُم ہیں سوالوں اور آئینوں سمیت
سب تحیّر خواب کا نقشِ مکرّر لے گیا

بادباں پھٹنے پہ دامن سے لیا تھا میں نے کام
آندھیوں میں ناؤ کو مرضی کے رُخ پر لے گیا

صبحِ ازل کی لَو کا افق میرا خواب ہے
آنکھوں میں تیرے نقشِ کفِ پا کی روشنی

اپنی سیاہیاں جو بنیں روشنائیاں
تب مجھ پہ منکشف ہو کچھ آبا کی روشنی

آئنے ٹوٹ گئے باتوں کے
دل میں ریزے ہیں ملاقاتوں کے

ہم بھی ہیں کھوئے ہوئے، سوئے ہوئے
ہم بھی ہیں روئے ہوئے راتوں کے

بال و پَر اپنے ہَواؤں کو لیے پھرتے تھے
اب ہَوائیں لیے پھرتی ہیں پَر و بال اپنے

یہ اور بات ہے کہ ہم آزاد ہو گئے
اُڑنے کا ذکر چھوڑیے، اُڑنا پروں سے ہے

چراغِ جسم! اِدھر بات سُن، ہَوا کی ذرا
یہ شعلگی، یہ تپِ ہست ہے ذرا کی ذرا

عجیب حالتِ دل ہوگئی رہائی کے وقت
کلیدِ قفلِ قفس کھوگئی رہائی کے وقت

عرصہ ہُوا ہے اِذنِ تکلّم چھنے ہوئے
کوہِ سخن پہ تجھ سے کوئی گفتگو نہیں

اب اُس کی سنگساری کا زمانہ آ گیا ہے
وہ جس نے روشنی کے ساتھ مُنہ کالا کیا ہے

وہ لوگ جن کی نظر کھا گئی ہے شہر کے شہر
گلِ سیاہ کی ہانڈی چھتوں پہ رکھتے ہیں

اِس کے سوا کوئی بھی تمنّا نہیں مجھے
بعد از وفات پھر سے نمو دے زمیں مجھے

سب کچھ عیاں ہے اُس کی خمیدہ کلاہ سے
سالار لاکھ بھید چھپائے سپاہ سے

اب تک نفس نفس میں ہے اُس جسم کا طلسم
اب تک ہوں چُور چُور خمارِ گناہ سے

یہ ندّیاں جو کہیں دُور جا کے مُڑتی ہیں
نجانے کون سے دریا کے ساتھ جُڑتی ہیں
لرزتی پلکوں کا بوسہ لیا تھا آخرِ شب
ابھی تلک سَرِ لب تتلیاں سی اُڑتی ہیں

سلام

میری نگاہ کی نمی کوفہ و شام تک گئی
سوز و سلام کی صدا میرے امامؑ تک گئی

جانے وہ کیا کلام تھا جو بہ سناں کیا گیا
اُس کی للک لپک لپک سارے عوام تک گئی

"اُس پہ مرا درود ہو، اُس پہ مرا سلام ہو"
وہ جو رسن بہ دست و پا منزلِ شام تک گئی

آپؐ کے ذِکر پاک نے فِکر کو جگمگا دیا
میرے سخن کی روشنی اہلِ خیام تک گئی

تیغِ علیؑ ولی چلی برق سی کَوند کَوند کر
کُفر کو رَوند رَوند کر اپنے مقام تک گئی

تشنہ لبوں کی دَین ہے کوئی بھی تشنگی نہیں
شوقِ نمود تک گیا، حسرتِ نام تک گئی

پی ڈی ایف
by
03145951212

کلام امام حسین علیہ السلام
خطبات، خطوط اور وصیتیں
ALIYA BOOKS
ایلیا بکس
H -7 کالج روڈ، لیاقت باغ چوک، راولپنڈی
Ph: +92 51 5771469